ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

انتظار حسین کا تعارف و سوانحی حالات۔۔۔ تجزیاتی مطالعہ

محمد نعیم
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر گلشن طارق
پروفیسر شعبہ اُردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

Abstract:
Intizar Hussain needs no introduction among the famous fiction writers and storytellers of the present era. After the establishment of Pakistan, Intizar Hussain has a unique and distinguished position in Urdu literature. His creative journey spans a long period of time, which holds a high position and wide rank in the literary, artistic and creative era. He did not try his hand at only one genre, but he had a field of different literary genres in front of him and he excelled in every genre as if he had inherited this literature. He had tried his hand in more or less all genres of fiction, novel, criticism, translation, travelogue, journalism, column writing, sketches, comedy, essays, drama and prose, but the position and rank that Intizar Hussain got was in fiction. He could not find them in other genres. The stories of Intizar Hussain have a great place and status in Urdu literature.

Keyword:
انتظار حسین، افسانہ نگار، تہذیبی و اخلاقی اقدار، آگرہ ہندوستان

عہدِ حاضر کے مشہور افسانہ نگار اور کہانی نگاروں میں انتظار حسین کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب میں انتظار حسین ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر ایک لمبے عرصے پر محیط ہے جو کہ ادبی، فنی اور تخلیقی دور میں ایک بلند پایہ مقام اور وسیع رتبہ رکھتے ہیں۔ انتظار حسین نے صرف ایک صنف پر طبع آزمائی نہیں کی بلکہ ان کے سامنے مختلف ادبی اصناف کا میدان تھا اور وہ ہر صنف میں اس طرح سرخرو ہوئے جیسے انہیں یہ ادب وراثت میں ملا ہو۔

انتظار حسین نے افسانہ، ناول، تنقید، ترجمہ، سفر نامہ، صحافت، کالم نگاری، خاکہ، مزاح، مضامین، ڈرامہ اور نثر کی کم و بیش تمام اصناف میں طبع آزمائی کی تھی لیکن جو مقام و رُتبہ انتظار حسین کو افسانوں میں ملا وہ ان کو دیگر اصناف سے نہ مل سکا۔ انتظار حسین کے افسانے اردو ادب میں شہرۂ آفاق مقام و رتبہ رکھتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں کی بنیادی خصوصیات ان میں موجود تہذیبی اور اخلاقی اقدار ہیں۔ انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں معاشرت، تہذیب خصوصاً ہندوستانی معاشرت کی عکاسی کی ہے۔

انتظار حسین کے سوانحی حالات خود ان کے بارے میں پوری اور درست معلومات نہیں دیتے کیونکہ افسانہ نگار جو ٹھہرے۔ انتظار حسین کی زندگی کے بارے میں اتنی روایات ہیں شاید اتنی ان کے افسانوں کے بارے میں نہ ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ انتظار حسین نے اس مسئلے کو سلجھانے میں خود کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔

انتظار حسین کی پیدائش کے بارے میں مختلف ماہرین اپنی مختلف آراء پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض محققین نے خود انتظار حسین سے مل کر اپنی آراء پیش کیں۔ انتظار حسین کی پیدائش مختلف مقام پر مختلف لکھی گئی ہے جبکہ جائے پیدائش کا مقام ایک ہی بتایا گیا ہے۔ انتظار حسین کی تاریخِ پیدائش اکثر جگہوں پر 21 دسمبر 1925ء بمقام ڈبائی ضلع بلند شہر اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ ہندوستان لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر حامد مرزا بیگ کے مطابق:

> ''ڈاکٹر حامد مرزا بیگ نے اپنی تالیف ''اردو افسانے کی روایت'' (1903۔1990ء) (اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، دسمبر 1991ء) میں طاہر مسعود کے مرتبہ کردہ ''انٹرویوز'' یہ وصال نامہ 1981ء مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر انوار احمد کی کتاب ''اُردو افسانہ'' اور نصابی کُتب میں درج تاریخ کو مسترد کرتے ہوئے 21 دسمبر 1922ء کی تاریخ درج کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ معلومات انہیں خود مصنف یا اس کے اور قریبی ذریعے سے حاصل ہوئی ہوں۔'' (1)

محمد عمر میمن کے مطابق:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

محمد عمر میمن نے انتظار حسین سے اپنی طویل گفتگو کا آغاز اسی سیدھے سادھے سوال سے کیا۔ڈاکٹر محمد عمر میمن لکھتے ہیں :

''میں نے انتظار حسین سے پیدائش کے بارے میں سوال کیا کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے لیکن اس کے جواب کے برعکس افسانہ نگار انتظار حسین آغاز میں طرح دے گئے۔'' (2)

''عمر میمن صاحب یہ بتانا میرے لئے کس قدر مشکل ہے کہ میں کب پیدا ہوا، کب سے ہوں، کیا بتاؤں جہانِ خراب میں۔۔۔'' (3)

مصنف کی طویل گفتگو کے بعد صرف ایک ہی ضمنی تفصیل رہ جاتی ہے کہ دستاویزی ریکارڈ کے مطابق انتظار حسین کی پیدائش 21 دسمبر 1925ء میں ہوئی تھی۔ اس تاریخ کو محض سہولت یا متفقہ فیصلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مندرجہ بالا بحث کے نتیجے میں یہ واضح ہوتا ہے کہ تاریخ پیدائش سے زیادہ انتظار حسین کی مقام پیدائش زیادہ روشن ہے۔ڈاکٹر سہیل احمد خان کے مطابق:

ڈاکٹر سہیل احمد خان سے ایک گفتگو کے دوران انتظار حسین نے اپنی جائے پیدائش کے بارے میں مبالغہ کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

''علی گڑھ کے قریب بلند شہر کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی، ڈبائی سنتے ہیں، اب بھی ہے۔ اسی بستی میں پیدا ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں دس گیارہ سال کی عمر تک اُسی بستی میں رہا ہوں۔ وہ تو دس سال تھے یا دس گیارہ سال تھے مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ ایک پوری صدی تھی۔ وہ علاقہ، وہ چھوٹی سی زمین، وہ بستی اس کے بارہ چھوٹے چھوٹے دیہات جہاں میں کبھی کبھی یکے پر بیٹھ کر جایا کرتا تھا اور کبھی بیل گاڑی میں۔ ان سب چیزوں کو خیال میں لاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ چھوٹی سی زمین پورا براعظم تھی۔ تو اب میں اس بستی کی کس کس چیز کا ذکر کروں؟'' (4)

ڈاکٹر عمر میمن کے ساتھ گفتگو:

اس بستی کی چیزوں کے ذکر سے ان کی کہانیوں کا پورا جہان آباد ہے۔ اس کے حوالے سے انتظار حسین نے محمد عمر میمن کے ساتھ گفتگو میں بھی ذکر کیا ہے۔

''جہاں میں پیدا ہوا اس بستی کا نام ڈبائی تھا۔ یہ بلند شہر کے ضلع میں علی گڑھ کے بالکل نواح میں واقع تھی۔ کوئی اہم تہذیبی مقام تو یہ نہیں تھا بس یوں سمجھئے کہ یہاں جو تہذیب پھل پھول رہی تھی وہ درختوں اور اکوّں کی تہذیب تھی۔ تو میں نے اس تہذیب کے اندر ہوش سنبھالا۔'' (5)

انتظار حسین نے پہلے غیر رسمی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ گھر سے حاصل کردہ تعلیم کے بعد شروع کیا۔ انتظار حسین نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے گھر سے ہی کیا۔ باقاعدہ رسمی تعلیم کا آغاز ان کے والد کے معتقدات اور زمانے کے تقاضوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ انتظار حسین کے والد چاہتے تھے کہ وہ روایتی مذہبی تعلیم حاصل کریں جبکہ انتظار حسین کے والد اسکول جانے کے سخت خلاف تھے۔ انتظار حسین کے باقاعدہ تعلیمی سلسلے کا آغاز ان کی بڑی بہن کے اصرار و تکرار کی بدولت ہوا اور انہوں نے انتظار حسین کو اسکول میں داخل کروایا اور یوں انتظار حسین کی باقاعدہ تعلیم کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ انتظار حسین نے انٹر میڈیٹ کا امتحان 1942ء میں آرٹس کے مضامین کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد بی اے کی سند 1944ء میں حاصل کی۔ انتظار حسین نے ایم اے اردو کی سند 1946ء میں میرٹھ کالج سے حاصل کی۔

انتظار حسین کے باپ کا اسمِ گرامی منظر علی تھا اور آپ کے دادا جان کا نام امجد علی تھا۔ آپ کے نانا جان کا نام وصیت علی تھا جبکہ انتظار حسین کی والدہ ماجدہ کا نام صغریٰ بیگم تھا۔

محمد عمر میمن کے طویل انٹرویوز کے دوران جب انتظار حسین سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ کے والد کا آپ کی ذہنی تشکیل میں کچھ عمل دخل رہا ہے، تو وہ کس نوعیت کا ہے؟۔ ''انتظار حسین نے کہا کہ وہ ایک بڑے مولوی قسم کے آدمی تھے۔'' (6)

انتظار حسین نے اس کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا:

''میں بچپن میں سنتا رہا ہوں کہ ہمارے خاندان کی ہر نسل میں کوئی نہ کوئی بڑا فقیر یا درویش یا صوفی جو بھی آپ کہنا چاہیں، ہوتا رہا ہے۔ میرے ایک بزرگ تھے میرے والد صاحب کے ماموں جو بڑے عالم قسم کے آدمی تھے اور پورے علاقے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

میں ایک صوفی اور بزرگ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ جہاں تک میرے والد صاحب کا معاملہ ہے تو افسوس ہے کہ وہ اس روایت میں نہیں تھے۔ وہ کچھ واعظ اور مبلغ قسم کے آدمی تھے۔'' (7)

وہ اپنے والد کے طرزِ فکر سے بدک کر بالکل ایک دوسرے راستے پر چلتے تھے اور چلنے کی کوشش کرتے تھے۔

انتظار حسین نے عالیہ بیگم سے مارچ 1966ء میں شادی کی۔ انتظار حسین کی بیوی کا انتخاب ان کی والدہ ماجدہ اور بڑی بہن نے کیا۔

ڈاکٹر ارتضیٰ کے مطابق:

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کے خط کے جواب میں انتظار حسین نے اپنی شادی اور خاندانی پس منظر کے متعلق تفصیلاً لکھا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''میں اپنی شادی اور خاندان کی تفصیلات کیا لکھوں؟ یہ تو روایتی قسم کی شادی تھی۔ مارچ 1966ء میں ہوئی۔ بیگم کا نام عالیہ بیگم ہے۔ یہ بنارس کا خاندان ہے جس کا سلسلہ نسب اودھ کے نوابین سے ملتا ہے۔ میرے اپنے خاندان کو ایسا کوئی شرف حاصل نہیں ہے۔''(8)

عالیہ بیگم نے ایک مرتبہ گفتگو کے دوران راقم الحروف سے مخاطب ہوتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے شادی سے پہلے انتظار حسین کے افسانے پڑھے تھے مگر ''مشرق'' اخبار میں کالم دیکھ کر سوچا کرتی تھی کہ یااللہ یہ شخص کیا کبھی گھر میں ٹکتا ہے۔ اُس وقت انہیں اندازہ نہیں تھا کہ گھر میں نہ ٹکنے والے اس آدمی کا گھر انہی کو بسانا ہے۔

عالیہ بیگم نے ان کے گھر کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کیا اور دلچسپی ظاہر کی۔ جس گھر میں انتظار حسین قیام پذیر تھے۔ آپ نے اپنے کالموں میں ذکر کیا تھا کہ ان کے تراشے ان کی بیگم عالیہ نے سنبھال کر رکھے تھے۔

عالیہ بیگم آخری عمر میں بیمار ہو گئیں تھیں اور طویل عرصے تک علالت میں زندگی گزاری اور آخر کار 2005ء میں اس فانی دنیا سے کوچ کر گئیں۔ آپ کو لاہور میں دفن کیا گیا تھا۔

جب انیسویں صدی کا اختتام ہوا اور اس کے بعد بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں دنیائے علم و ادب میں بے بہا اضافہ ہوا۔ مختلف انواع کے ادب پروان چڑھنے لگے۔ بیسویں صدی عیسوی کے دور کو معلومات کا خزانہ اور ذخیرہ تصور کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں کسی ایک فرد کے بارے میں اتنی معلومات ملتی ہیں جو کہ اس سے پہلے ایک ناقابلِ تصور تھیں۔ اس کے علاوہ کسی ایک واقعے کے بارے میں بھی اتنی معلومات موجود نہ تھیں کہ ان کے بارے میں جان کر ڈر معلوم ہونے لگتا۔ اس طرح انتظار حسین کے بارے میں تفصیلاً اور باریک بینی سے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں اور بیسویں صدی عیسوی میں انتظار حسین کے بارے میں بھی معلومات کا ایک ناقابلِ اختتام سلسلہ موجود ہے۔ انتظار حسین کے بارے میں زیادہ کثرت سے نہ صحیح لیکن بیسویں صدی عیسوی میں ان کے بارے میں ضروری اور اہم معلومات تو حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس کے باوجود انتظار حسین کی پیدائش کے بارے میں درست معلومات کے بارے میں ابہام اور شک پایا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ انتظار حسین کی خود اپنی ذات ہے کیونکہ وہ خود اپنی زندگی کے بارے میں درست معلومات نہیں رکھتے تھے۔ شاید اس کی وجہ انتظار حسین کی آزاد خیالی تھی۔ وہ اپنی تاریخ پیدائش کو ایک عام انداز اور قیاس سے بتاتے تھے جیسا کہ آج سے کئی سو سال پہلے کے لوگ تاریخ اور دنوں کو واقعات سے منسوب کرتے تھے۔ انتظار حسین خود 1857ء کی جنگِ آزادی کے واقعات کو بجائے مقرر تاریخ اور سال سے یاد اور بتاتے لیکن اس کے برعکس وہ 1857ء کو غدر کے نام سے منسلک کر کے بات ختم کر دیتے تھے۔

انتظار حسین کے سوانحی حالات کو ان کے افسانوی کرداروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس طرح ان کے کرداروں پر دیومالائی اور پراسراری دھند چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس نسبت سے یہ دیکھائی دیتا ہے اور ابہام پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب خود ان کا کیا دھرا نظر آتا ہے۔ انتظار حسین کے ابتدائے قلم کے بارے میں بھی مختلف قیاس اور اندازے بیان کیے گئے ہیں جن کا ثبوت انتظار حسین کی ذات نے خود تسلیم کیا اور اس کی تصدیق بھی خود کی ہے۔

جب انتظار حسین نے قلم اُٹھایا تو بہ زبانِ انتظار حسین نے افسانہ نگاری کا میدان اپنے ایک دوست کے لئے وقف کر رکھا تھا اور وہ یقین سے کہتے تھے کہ یہ میدان تو ان کے دوست کیلئے مخصوص تھا۔ وہ خود اپنے لئے شاعری اور تنقید کے میدان کو بہتر سمجھتے تھے۔ اس بات کا خیال انہوں نے کئی بار مختلف مواقعوں پر اپنے مختلف دوستوں سے کیا۔ ایک گفتگو میں انتظار حسین نے اس بات کا اظہار عمر میمن سے کیا۔

''صاحب بات یہ ہے کہ جب میں کالج کی زندگی گزار رہا تھا تو میرے یہاں ایک خواہش ادیب بننے کی ضرور موجود تھی اور

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

میں اس کا مطالعہ بھی کر رہا تھا۔" (9)

اس گفتگو میں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ افسانہ نگار تو ان کے بچپن کے دوست ریوتی سرن شرما کو بننا تھا۔

"تو اس کے یہاں افسانہ نگار بننے کی خواہش بہت شدید تھی اور میں نے گویا یہ طے کر لیا تھا کہ افسانہ نگار تو اسے بننا ہے اور اگر میں کچھ بنوں گا تو نقاد بنوں گا۔" (10)

اپنے آغاز کے بارے میں انتظار حسین نے ڈاکٹر سہیل احمد کے ساتھ ایک گفتگو میں بھی اظہار خیال کیا تھا۔

"ہاں بات یہ ہے کہ افسانہ لکھنا میرا مقصود نہیں تھا۔ مجھے کچھ یہ تصور تھا کہ افسانہ تو ریوتی ہی نے لکھنا ہے میں کچھ تنقید لکھوں گا یا شاعری کروں گا۔" (11)

مندرجہ بالا دونوں گفتگو کے نتیجے کے طور پر یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ انتظار حسین کو آغاز میں افسانہ نگاری سے کوئی دلچسپی اور لگن نہ تھی لیکن 1946ء کی دہائی کے حالات و واقعات اور فسادات کو مد نظر رکھتے ہوئے انتظار حسین کو اپنے خیالات کو ترک کرنا پڑا اور تنقید اور شاعری کے فن و ادب سے منہ موڑ کر افسانوی میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھانے پڑے اور افسانہ نثر کو اپنی قلم کی زینت بنایا۔

گویا انتظار حسین کی افسانہ نگاری 1946ء کی دہائی کے پُر اسرار، واقعات اور احساسات کی عکاسی کرتی ہے جو شاعری اور تنقید کے برعکس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین شاعری اور تنقید کے سانچے میں ڈھل نہ سکے اور خود کو افسانوی میدان میں ڈھال لیا۔

انتظار حسین نے اپنی ملازمت کا آغاز قیام پاکستان کے بعد بطور صحافی کیا۔ آپ نے اُردو کالم نگاری میں جوہر دکھائے اور اس کے علاوہ انگریزی کالم نگار کے طور پر بھی اپنی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ کا زیادہ تر ذریعہ معاش صحافت سے ہی منسلک رہا تھا۔ انتظار حسین نے جن اخبارات میں اپنی خدمات سرانجام دیں اور پیشہ صحافت سے منسلک رہے اور جن اخبارات، رسائل میں ملازمت اختیار کی ان کے نام اور تفصیل بھی مندرجہ ذیل ہے۔

انتظار حسین کی ملازمت کا آغاز کار اخبار روزنامہ "امروز" لاہور بحیثیت سب ایڈیٹر 1949ء تا 1953ء تک تھا۔ اس کے بعد انتظار حسین نے روزنامہ "آفاق" لاہور میں بحیثیت کالم نگار اور سب ایڈیٹر 1955ء تا 1957ء تک کام کیا۔ انتظار حسین ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور کی ادارت بھی کرتے رہے تھے۔ انتظار حسین ایک لمبا عرصہ تک روزنامہ "مشرق" سے وابستہ رہے جس میں انتظار حسین نے شہر کے حوالے سے مستقل کالم اور ادبی فیچر لکھے۔ ان کی ادبی تحریروں (کالموں) کا انتخاب ایک منفرد کتاب کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

انتظار حسین نے 1988ء میں روزنامہ "مشرق" سے ریٹائرمنٹ لے لی اور اس کے بعد آپ نے اپنی ادبی خدمات بحیثیت ایک آزاد قلم کار اور صحافی کے طور پر کالم نگاری جاری رکھی۔

انتظار حسین کی پیش کردہ معلومات میں ان کے اساتذہ کرام کا ذکر بھی کہیں نہ کہیں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو ملتا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے اساتذہ کرام کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کالج کے دور کے اساتذہ کرام میں پروفیسر کرار حسین کا ذکر خصوصاً اور منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ جن سے انتظار حسین نے کافی گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اپنے استاد پروفیسر کرار حسین کے بارے انتظار حسین نے ڈاکٹر محمد عمر میمن سے ایک گفتگو کے دوران بیان کیا کہ:

"میرٹھ کالج میں کچھ شخصیتیں ضرور ہیں جو مجھے یاد ہیں، پروفیسر کرار حسین جو کہ میرے استاد ہیں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ میرے شاگرد ہونے سے پہلے بھی میں انہیں دیکھتا رہتا تھا۔ میں جس بستی میں پلا بڑھا وہاں بھی انہیں دیکھا۔ وہ ہمارے عزیزوں میں سے تھے۔ وہ ایک بڑی شخصیت کے طور پر میرے ذہن میں ہیں۔ اس عہد میں جس میں بہت سی شخصیتوں کو میں بڑا سمجھتا تھا اور بہت سے لوگوں کی تصویریں میرے ذہن میں بنی تھیں ان میں سے کچھ بگڑ گئی، بہت سے بُت مسمار ہو چکے لیکن کرار حسین کا امیج آج بھی میرے ذہن میں سلامت ہے۔" (۱۲)

اس کے بعد یعنی میرٹھ کالج کے قیام کے بعد پروفیسر کرار حسین نے مختلف تعلیمی اداروں میں اپنی خدمات انجام دیں۔ جن میں سرفہرست بطور وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ خدمات سرانجام دیں۔ پروفیسر کرار حسین ملک کے نامور اور ممتاز ماہر تعلیم کے طور پر جانے جاتے تھے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

جس وقت انتظار حسین نے عمر میمن سے یہ گفتگو کی تھی اس وقت پروفیسر کرار حسین حیات تھے۔ پروفیسر کرار حسین کی وفات کے بعد انتظار حسین نے ان کے پیش کردہ مضامین اور خطبات کو عملی جامہ پہنا کر ایک کتابی صورت میں پیش کیا۔ جس کا عنوان انتظار حسین نے ''سوالات اور جوابات'' کے عنوان کے طور پر پیش کیا۔ اس کی اشاعت 1999ء میں کراچی سے کی تھی۔

پروفیسر کرار حسین کے علاوہ انتظار حسین نے اپنی معنوی استادوں کا ذکر کیا ہے۔ معنوی استادوں میں اہم نام محمد حسن عسکری کا پیش کیا۔ حسن عسکری افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے جدید اردو ادب کا ایک منفرد نام ہے۔

انتظار حسین کی ملاقات عسکری صاحب سے میرٹھ میں ہوئی۔ انتظار حسین نے اپنے استاد عسکری کے کہنے پر ہی ہجرت پاکستان کرنے کا ارادہ کیا۔ انتظار حسین کی ملاقات، روداد اور تعلقات کا ذکر آپ نے ایک شخصی خاکے کے طور پر محفوظ کر چکے ہیں۔

انتظار حسین نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء شاعری سے کی۔ ن م راشد کی ''ماورا'' سے گہرا اثر قبول کیا اور اس انداز میں آزاد نظمیں لکھنے کا آغاز کیا۔ لیکن جلد ہی وہ شاعری سے افسانہ نگاری کی طرف آگئے۔

انتظار حسین نے اپنی پہلی کتاب تقسیم اور ہجرت سے قبل مکمل کر لی تھی اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کتاب کا موضوع لسانیات تھا۔ ایک گفتگو کے دوران انتظار حسین نے راقم الحروف کو بتایا کہ ایم اے کی تکمیل کے دوران انہیں لسانیات سے دلچسپی ہو گئی اور انہوں نے اردو لسانیات کے بارے میں پوری کتاب لکھ ڈالی۔ وہ اس کتاب سے مسودے کے ساتھ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے پاس گئے جن سے وطنی تعلق کی نسبت بھی تھی۔ مولوی عبدالحق نے ریاض الحسن کو یہ مسودہ دکھانے کا مشورہ دیا، اس کتاب کے بعض حصے ایک یا دو مضامین کی صورت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے رسالے، ''جامعہ'' میں شائع ہوئے۔ انتظار حسین نے اس کتاب کے مسودے یا ان مضامین کی کوئی نقل بھی محفوظ نہ رکھی اور لسانیات سے ان کی دلچسپی بھی اس کے ساتھ ختم ہو گئی۔

انتظار حسین کے سوانح اور ادبی زندگی، دنوں میں ایک اہم مرحلہ پاکستان کی نوآزاد مملکت میں ان کی ہجرت ہے۔ میرٹھ سے لاہور آنے کے لئے فوری محرک محمد حسن عسکری ثابت ہوئے جنھوں نے لاہور آکر ریڈیو پاکستان کے اعلانات کے ذریعے سے پیغام بھیجا اور یہاں آنے کی دعوت دی۔ اسی مشورے کو قبول کر کے انتظار حسین ایک نئے وطن کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ عمل چاہے کتنا بھی اضطراری رہا ہو، اس کے نتائج بہت دور رس نکلنے تھے اور انہوں نے ہی انتظار حسین کے آئندہ کام کو تشکیل دیا۔

نظریہ بننے سے پہلے یہ ہجرت ان کے لئے واقعہ بنی۔ ریل کے اس سفر کا مختصر سا حال انہوں نے ''چراغوں کا دھواں'' کے پہلے باب میں لکھا ہے، اور سفر کے خطرات کے سامنے یاروں کی ٹولی کی فقرے بازی کا احوال درج کیا ہے۔ اسی سفر کا ایک اور رخ سلیم احمد نے بھی لکھا ہے جو اس دوران رفیق سفر تھے۔ انتظار حسین کی یادوں میں سلیم احمد کردار بن جاتے ہیں اور سلیم احمد اپنی نظم انتظار حسین کو کردار بنا دیتے ہیں۔ طویل نظم ''مشرق'' میں سلیم احمد نے '' نام کا سفر'' کے عنوان کے تحت اس نظم کے ایک حصے میں اس کا سفر کا احوال اس طرح شروع کیا ہے۔

ہجرت انتظار حسین کے لئے کوئی سادہ سوال نہیں رہی۔ انہوں نے اس کی سیاسی تاویل بھی دہرائی ہے مگر وہ اس کو بنیادی طور پر ایک ادبی تجربے کی حیثیت سے دیکھتے آئے ہیں، مگر یہ سوال ان کے لئے اب بھی محرک فراہم کرتا ہے۔ ''چراغوں کا دھواں'' کے پہلے باب میں وہ ذکر کرتے ہیں کہ کسی ٹی وی کمپیئر نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے کس تصور کے تحت ہجرت کی تھی اور ان سے اس سوال کا جواب نہ بن پڑا۔

> ''اکھڑی ہوئی خلقت کا ایک سیلاب امڈا ہوا تھا اور سیلاب میں بہت سا خس و خاشاک بھی بہتا چلا آتا ہے۔ تو بس ایسے ہی یہ تنکا بہہ کر یہاں سے چلا آیا۔''(13)

اس کے بعد وہ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہجرت کے بارے میں کسی بھی سوال پر اپنے جوش و جذبے کا حال سناتے ہیں اور بڑی توجیہات پیش کرتے ہیں۔ مگر اپنے حوالے سے وہ ایسی کوئی توجیہات پیش نہیں کرتے:

> ''تب میں نے بیتے دنوں کو یاد کیا، میرٹھ کے دنوں کو، مگر نہ کسی اسٹوڈنٹس یونین میں اپنی شرکت کی یاد آئی نہ کسی سیاسی پارٹی کے جلسے جلوس کی ایسی یاد آئی کہ اس میں شامل ہو کر نعرہ لگایا ہو یا کم از کم تماشائی کی حیثیت ہی سے چار قدم ساتھ چلا ہوں۔۔۔۔۔''(14)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

ہجرت کا یہ عمل ایک ادبی تصور کے طور پر بھی آغاز از کار سے ہی ان کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا مگر اپنی اس تحریر میں وہ اس سے بھی ایک طرح کی بریت کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کے مطمع نظر کوئی فلسفہ نہ تھا:

> ''مقصود صرف اتنا تھا کہ جب اتنے بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی ہے تو اسے اپنی تاریخ کے کسی بڑے تجربے کے ساتھ پیوست کر کے دیکھا یا جائے کہ شاید اس سے اس عمل میں کوئی بڑے معنی پیدا ہو جائیں۔ مگر اپنی نجی نقل و مکانی کو کسی قسم کے معنی پہنانے کا یا آئیڈیلائز کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔''(15)

ہجرت کا تجربہ ان کے یہاں بڑی تفصیل سے سامنے آتا ہے اور ان کی بہت سی تحریروں میں رنگ بھرتا ہے۔ ، جہاں براہ راست اس کا بیان نہیں وہاں بھی اس کے مضمرات موجود ہیں اور اسی حوالے سے انور عظیم اور وحید اختر جیسے ہندوستانی نقادوں نے ان پر اعتراضات کئے تھے جو اب بھی انتظار حسین کی کہانی کا ایک حصہ ہیں۔

لاہور میں ان کا قیام عارضی ثابت نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنے لئے اسی شہر کو پسند کیا۔ میر ٹھ بڑھ کر لاہور میں اب ان کی ادبی شناخت کا حصہ ہے اور ''چراغوں کا دھواں'' لکھ کر تو وہ دور جدید میں اس شہر کے سب سے بڑے واقع نگار بن گئے ہیں جنھوں نے اس کے بدلتے ہوئے در و دیوار، رنگ ڈھنگ اور موسم اور اس کی سبھا سجانے والے افراد کا ایک پورا نگار خانہ اپنی کتاب کے اوراق میں زندہ کر دکھایا ہے۔ لاہور کے ابتدائی دنوں میں ایک ایک کر کے وہ لوگ ملتے گئے جن سے انتظار حسین کا شب و روز کا ساتھ رہا۔ سہیل احمد خان کے ساتھ گفتگو کے دوران انھوں نے ان رفاقتوں کا حوالہ دیا ہے:

> ''اسی زمانے میں ناصر سے ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات اتنی بڑھی کہ رفتہ رفتہ یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں میرا اصل ہم سفر ناصر کاظمی ہے۔ اسی زمانے میں ناصر کے توسط سے بعض اور لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ حنیف رامے سے ملاقات ہوئی، شیخ صلاح الدین سے ملاقات ہوئی، شاکر علی سے ملے، مظفر لی سید سے، احمد مشتاق سے اور پھر ہم نے رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا ہم پوری ایک نسل ہیں۔ گویا اس ملک میں ایک تخلیقی جزیرہ نمودار ہو گیا اور ہم نے یہ محسوس کیا کہ اب جو تخلیقی روشنی پورے ملک میں پھیلے گی وہ اس جزیرے سے پھیلے گی۔ اس احساس کے ساتھ ہمارے ہاں پھیلی نسلوں سے بغاوت اور انحراف کے اعلان کا جوش بھی پیدا ہوا۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں پہلا اعلان بغاوت تھا جو ہم نے بلند کیا کیونکہ اس وقت تک یہ صورت تھی کہ 36ء نسل کے خلاف لوگوں کو دم مارنے کی جرات نہیں ہوتی تھی لیکن ہم نے پاک ٹی ہاؤس کے گم نام گوشوں سے اللہ کا نام لے کر اعلان بغاوت کیا۔ یہ جو ہماری نئی نسل تھی اس میں مصور بھی تھے اور لکھنے والے بھی۔ بعد میں کچھ اختلافات بھی پیدا ہوئے رفتہ رفتہ چار پانچ آدمی بالکل الگ الگ نظر آنے لگے جن کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے حنیف رامے، ناصر، شیخ صلاح الدین، میں، احمد مشتاق، غالب احمد، (جو بعد میں اپنی ملازمت وغیرہ کے چکر میں پڑ گئے) تو یہ ایک جزیرے کے اندر ایک چھوٹا سا جزیرہ نمودار ہوا۔''(16)

راقم الحروف سے گفتگو کے دوران انتظار حسین نے اس فہرست میں دوستوں سعید محمود کے نام کا اضافہ کیا جو اس وقت پاکستان میں ان کے سب سے پرانے قریبی دوست ہیں۔ ماقبل غدر کے تذکرے ''رست خیز بے جا'' میں انتظار حسین نے ایک مخصوص انداز میں موجودہ دور کے ملتے جلتے ناموں والے بعض ادیبوں کا ذکر کیا ہے جن میں خلط مبحث ہو جاتا ہے اور بعض مختلف الخیال ادبی، جیسے، جمیل جالبی حبیب جالب اور افتخار جالب ایک ہی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس خدشے کے تحت کہ کہیں آگے چل کر انتظار حسین کے ساتھ یہ معاملہ در پیش نہ آئے۔ یہاں انتباہ ضروری ہے۔ ورنہ مستقبل میں کوئی بچھڑا اپنی تحقیق کی رو سے یہ اعلان نہ کر بیٹھے کہ دراصل انتظار حسین ایسے بھی ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے پرانے دور کے ڈرامہ نگار اور ناول نویس انتظار حسین ایک علیحدہ شخصیت تھے۔ ریڈیو کے عروج کے دنوں میں اکثر ناموں میں دھوکا ہوتا تھا۔ انتظار حسین نے راقم الحروف سے ایک گفتگو میں کہا کہ اس زمانے میں کراچی آنا ہوتا تھا تو ان کا نام سن کر بعض لوگ ریڈیو کے ڈراموں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ جس طرح پہلے ناموں کی مماثلت سے دھوکا ہو سکتا تھا، اب ایک اور شخصیت سے امتیاز لازم ہے۔ انٹرنیٹ پر اگر انتظار حسین کے نام پر گوگل سرچ کی بجائے تو اس کتاب کا موضوع بننے والے انتظار حسین کے علاوہ دوسری تفصیلات بھی شامل آئیں گی جو ان کی ایک اور ہم نام شخصیت سے متعلق ہیں۔ یہ انتظار حسین لاہور میں رہتے ہیں اور ان کی وجہ شہرت کرکٹ سے وابستگی ہے۔ ان صاحب کا ادب سے اسی قدر تعلق ہو گا جتنا کہ اس کتاب کے موضوع انتظار حسین کے کرکٹ ہے۔ مشتری ہشیار باش، کوئی محقق آگے چل کر ثابت نہ کر دے کہ انتظار حسین اصل

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

میں کرکٹ کے کھلاڑی تھے اور افسانہ نگاری ان پر تہمت ہے۔ وجہ مجید امجد کی نظم " آٹو گراف" بھی کچھ مداوانہ کر سکے گی۔ بعض لوگوں کو تتلیاں پکڑنے کا شوق ہوتا ہے۔ انگریز کے ایک معاصر ناول نگار جان فاؤلز نے ایک ناول میں ایسے شخص کا احوال بیان کیا ہے۔

"جس کا یہ شوق بڑھ کر جنون بن گیا تھا۔ انواع واقسام کی تتلیوں کو دور دور سے پکڑنے کے بعد وہ کاغذوں پر چپکا کر، پن سے چبھو کر ڈبوں میں بند کر کے ترتیب سے رکھا کرتا تھا۔"(17)

کسی زندہ ادیب کے سوانحی حالات وآثار مرتب کرنا بھی اس قسم کا کام معلوم ہوتا ہے۔ کاغذ پر چپکی ہوئی تتلی بھی اتنی خوش رنگ معلوم ہوتی ہے لیکن اڑنے اور ہوا میں رنگ بکھیرنے کے قابل نہیں رہتی۔ زندہ ادیب کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہے کہ اسے ساکت اور کسی ایک نکتے کا پابند نہیں کیا جاسکتا، اور یہ توقع رہتی ہے کہ اب اس کی پرواز کسی نئے پھول کی طرف یا گلشن کے کسی نادیدہ گوشے کی طرف ہوگی اور اس کی بدولت رنگ چمن ایک بار پھر بدلے گا۔ انتظار حسین کے بارے میں سوانح کا یہ باب ہمیں اسی لئے ادھورا چھوڑنا ہی اچھا لگ رہا ہے۔ دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا۔

بھلا وہ کون سا شخص ہے جس کی موت پیش گفتہ یعنی مارکیز کے الفاظ میں پیش گوئی نہیں؟ اس لئے انتظار حسین نے اپنی کہانی کا انجام خود ہی تجویز کر لیا تھا۔ انتظار حسین نے اپنے بارے میں مکالمہ نگاری کرتے ہوئے یعنی خود کلامی کا اسلوب اپنے کلیدی مجموعے " آخری آدمی" میں کیا۔ اس میں انہوں نے مضمون کا اضافہ کیا اور اپنے کرداروں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

" میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کی حرکت قلب بند ہو جاتی ہے اور وہ مر جاتے ہے ہیں یا موٹر کے نیچے آجاتے ہیں اور کچلے جاتے ہیں، میں ان درماندوں میں سے ہوں جو کوئی زہریلی چیز کھالیتے ہیں۔ گھل گھلا کر مرتے ہیں۔"(18)

انتظار حسین نے اپنا تعزیت نامہ بھی خود تحریر کر دیا تھا۔ اس تعزیت کا عنوان انتظار حسین نے " تیرے بعد تیری بیتیاں" جس میں موت شگفتگی در مسرت کا بہانہ بننے لگتی ہے۔

انتظار حسین کے دوست اور مداح انتظار حسین کو ہشاش بشاش اور روزمرہ کے معمولات میں خوش و خرم دیکھتے تھے۔ لیکن بیماری نے ان کو اچانک گھیر لیا اور انتظار حسین گھر میں بیٹھے بٹھائے ان کی ران کی ہڈی میں بل پڑ گیا۔ اس کی وجہ سے ان کو لاٹھی کا سہارا لینا پڑا۔ اس کے بعد انتظار حسین کے گردوں میں تکلیف ہونا شروع ہو گئی اور دل رفتار میں تواتر کی وجہ سے دل کی رفتار بڑھانے والا آلہ لگا دیا گیا۔ ان تکالیف کے باوجود زندہ رہنے کی خواہش میں کمی نہ آئی اور ان تمام تکالیف کے باوجود دوستوں سے ملاقاتیں، کالم نگاری اور ادبی تقریبات میں شرکت کا سلسلہ جاری وساری رہا۔ کراچی میں ہونے والے لٹریچر فیسٹول میں شرکت کا ارادہ کیا۔ آپ نے ۱۶ فروری کے آغاز میں یہ پروگرام بنایا اور اس کے علاوہ دہلی میں جشن ریختہ میں شرکت کا بھی ارادہ تھا لیکن یہ تمام سفری ارادے ادھورے رہ گئے۔

ہفتے کا دن اور ۲۳ جنوری ۲۰۱۶ء کی تاریخ تھی۔ بقول مسعود اشعر شام کو میری ان سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ گھر سے باہر ہو گئے تھے اور گھر آکر انہوں نہارہے تھے اس لئے حرارات ہو رہی ہے اور اب وہ آرام کریں گے اور باقی باتیں کل ہوں گی۔ اگلے دن انہوں نے فون نہیں اٹھایا اور یاروں نے مجھ سے کہا کہ وہ لیٹ گئے ہیں۔ جب اتوار کو وہ اپنے معمول کے مطابق شام کو نیرنگ گیلری میں نہیں گئے تو ان کے دوستوں کو تشویش ہوئی اور وہ ان کو دیکھنے ان کے گھر چلے گئے۔

میں مسعود اشعر، شاہد حمید، اکرام اللہ، زمان خان اور زید ڈار شامل تھے۔ جب اکرام اللہ نے دیکھا کہ انتظار حسین نے گولیاں کھالیں ہیں اور بخار پھر بھی نہیں اُترا اور ابھی تک تیز ہے۔ اکرام اللہ نے ہسپتال جانے کا مشورہ دیا۔ انتظار حسین نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی اور کام کو کل پر چھوڑ دیا۔ مسعود اشعر کے بقول اگر انتظار حسین اس دن ہی ہسپتال چلے جاتے تو طبیعت زیادہ خراب نہ ہوتی۔ زمان خان وہاں پہنچے، دوستوں نے ان کی خیریت بتائی۔ مسعود اشعر نے بتایا کہ انتظار حسین نے میرے والد اور بیگم کی بیمارے کے بارے میں پوچھا۔ انتظار حسین نے اس آخری ملاقات میں رخشندہ جلیل کی کتاب جو کہ ترقی پسند ادب کے بارے میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بارے میں دریافت کیا کہ ان کو یہ کتاب کیسی لگی۔ محمود الحسن نے بتایا کہ ان کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ پھر اتوار کے بعد پیر کو ان پر غنودگی سی طاری ہو گئی اور جو دوست احباب ان سے ملنے گئے تھے سکتہ طاری ہونے کی وجہ سے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ہارون نے اس حالت کو دیکھ کر ایرج مبارک کو اطلاع دی۔ جس پر انہوں نے منگل کے دن انتظار حسین کو ڈیفنس نیشنل ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی لیکن اس کے باوجود ڈاکٹروں کی پوری ٹیم ان کو ہوش میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

بے ہوشی کی حالت میں 2 فروری 2016ء کو دوپہر کے 2 بج کر 45 منٹ پر انتظار حسین اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی نماز جنازہ 3 فروری 2016ء کو

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

پڑھائی گئی اور ان کے جسدِ فانی کو فردوسیہ قبرستان فیروز پور روڈ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اور اس طرح ادب کا ایک باب بند ہو گیا۔

حوالہ جات

۱۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، بحوالہ: آصف، فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۱-۱۲

۲۔ عمر میمن، بحوالہ: ایضاً، ص: ۱۲

۳۔ ایضاً، ص: ۱۲

۴۔ سہیل احمد خان، بحوالہ: ایضاً، ص: ۱۳

۵۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین شخصیت اور فن، ص: ۱۳

۶۔ ایضاً، ص: ۱۴

۷۔ ایضاً، ص: ۱۴

۸۔ ارتضی کریم، ڈاکٹر، بحوالہ: آصف فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین شخصیت اور فن، ص: ۲۴

۹۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین شخصیت اور فن، ص: ۱۵

۱۰۔ ایضاً، ص: ۵۱

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۵

۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۶

۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۰

۱۵۔ ایضاً، ص: ۲۰

۱۶۔ ایضاً، ص: ۲۲

۱۷۔ ایضاً۔، ص: ۲۷

۱۸۔ انتظار حسین، خود کلامی، بحوالہ: مسعود اشعر، شب چراغ افسانہ، ص: ۴۷